علّامہ اقبال کے افکار و خیالات (۲)

—— ڈاکٹر اسرار احمد ——

نشأۃ ثانیہ کی جدوجہد میں اقبال کا مقام

برعظیم پاک و ہند میں مجددین کا سلسلہ ایک "سلسلۃ الذہب" (سنہری زنجیر) تھا جو شیخ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ دہلوی' سید احمد بریلوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ علیہ تک پہنچا۔ اس سے آگے جو ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کی اہم ترین شخصیت علامہ اقبال ہیں۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا حصہ (contribution) فکر اسلامی کی تجدید ہے۔ یعنی جدید علم کلام' جدید سائنس' جدید ریاضی اور جدید سائیکالوجی کی بنیاد پر ایمان باللہ اور یقین کی کیفیت کو دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش۔ کیونکہ اس دور میں امام رازی یا کسی اور کا علم کلام کام نہیں دے سکتا۔ اُس میں یونانی فلسفہ اور یونانی منطق کا جواب تھا۔ اب یونان کا فلسفہ مرچکا' یونان کی منطق دفن ہو چکی' اب تو جدید سائنس کا دور ہے۔ اس سائنس کے حوالہ سے نئی سوچ آئی ہے' نیا فکر آیا ہے۔ نئی نئی جہتیں (dimensions) متعارف ہوئی ہیں' انسان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا ہے۔ اس اعتبار سے دین کے بنیادی حقائق کو مبرہن کرنا' ان کو مؤکد اور مدلل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کا آغاز علامہ اقبال نے کیا۔ اپنی اس تحریری کاوش کا نام انہوں نے Reconstructions of Religious Thought in Islam رکھا' جس کا ترجمہ سید نذیر نیازی مرحوم نے "الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل نو" کے نام سے کیا۔

اقبال کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ دین اور دنیا میں پیدا ہونے والی دوئی کو مٹانا اور دین و سیاست کو باہم جوڑنا ہے۔ آج پوری دنیا سیکولرزم کی گرویدہ ہو چکی ہے۔ مگر یہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو مسلمانوں کا خلیفہ یا امیر ہے وہی ان کا سپہ سالار ہے' وہی ان کا روحانی' علمی اور مذہبی راہنما ہے۔

© rasailojaraid.com

اس کے بعد کیا ہوا؟ حکومت علیحدہ اور دین علیحدہ ہو گیا۔ سلاطین و ملوک یعنی اصحابِ سیف ایک طرف اور اصحابِ قلم و قرطاس دوسری طرف۔ یہ علماء' محدثین' مفسرین اور فقہاء رجال دین ہیں۔ آگے چل کر رجال دین بھی دو قسم کے ہو گئے۔ ایک علوم ظاہریا معقولات کے پڑھنے والے اور دوسرے علوم باطن رکھنے والے یعنی صلحاوصوفیاء۔ اس طرح امت کی قیادت کی توحید تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بقول اقبال ؂

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اقبال نے یہ شعر پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کی بدلتی ہوئی صورتحال کے بارے میں کہا تھا کہ تثلیث کے فرزند یعنی امریکہ اور یورپین' جو کرسچین تھے' میراث خلیل یعنی پورا مڈل ایسٹ' حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ حکومت کے حصے بخرے کر کے' لے گئے۔ لیکن میں اسے اس مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں کہ توحید قیادت تقسیم ہو کر تثلیث قیادت ہو گئی۔ عبداللہ بن مبارک تبع تابعین میں سے معروف فقیہ ہیں' انہوں نے اس زوال پر مرثیہ کہا ہے' اُن کا ایک شعر ہے :

مَا اَفۡسَدَ الدِّیۡنَ اِلاَّ الۡمُلُوۡکُ
وَاَحۡبَارُ سَوۡءٍ وَرُھۡبَانُھَا

دین میں جتنا بھی فساد پیدا کیا ہے وہ تین طبقوں نے کیا ہے۔ بادشاہ' علماء سوء یعنی وہ عالم جو علم کو دولت کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں اور وہ راہب (صوفی) جو تصوف کے پردے میں دنیا داری کرتے ہیں۔ اسی کو اقبال نے اس طرح کہا ؂

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ مُلّائی و سلطانی و پیری

یہاں بھی وہی تین گروپ ہیں جنہوں نے دین کے تصورات کو بُری طرح متاثر کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ؂

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری' ہوس کی وزیری

© rasailojaraid.com

نیز ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک کلی وحدت ہے' اس کا مکمل نظام ہے۔ یہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے اور یہ کسی اور نظام کے تابع ہو کر نہیں رہتا' ورنہ وہ مذہب بن جاتا ہے۔ بقول اقبال ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمارے یہاں تینوں مذہبی طبقات کے اندر بہت اونچی شخصیات ایسی پیدا ہوئیں جنہوں نے مسلمانوں کو یہ درس دیا ——— ایک دیوبندیوں میں' ایک بریلویوں میں اور ایک اہل حدیث میں ——— یہ سبق کہ ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرو' انگریز کی مخالفت مت کرو' اس نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ میں محولہ بالا تینوں شخصیات میں سے کسی کا نام نہیں لیتا' نہ یہ سمجھا جائے کہ کسی ایک طبقے کی بات ہو رہی ہے اور نہ ہی میں ان کی بات کو بدنیتی پر محمول کرتا ہوں (معاذ اللہ)۔ میں سمجھتا ہوں اُن کی نیت کی حد تک معاملہ حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ انگریز یہاں سے چلا گیا تو ہندو ہماری تکہ بوٹی کر دے گا' اب ہمارے اندر دم خم نہیں ہے۔ لہٰذا وہ سمجھتے تھے کہ بہت غنیمت ہے کہ اگر انگریز یہاں رہے۔ ممکن ہے یہ انگریز ہی کی پڑھائی ہوئی پٹی ہو۔ "Divide and rule" اس کا اصول تھا اور وہ بہرحال ہندوستان پر قابض رہنا چاہتا تھا۔ ہندوستان سونے کی چڑیا تھی' یہاں سے اسے بہت کچھ ملتا تھا۔ یہ تو دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریز کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ اُس وقت حالات بدل گئے' عالمی صورت حال تبدیل ہو گئی' مغرب سے امریکہ نمایاں ہو گیا' ورنہ یہ سونے کی چڑیا چھوڑنے کے لئے کوئی آسانی سے تیار ہو سکتا تھا؟ بہرحال یہاں ایک طبقہ انگریزوں کا وفادار ہو چکا تھا' اگرچہ ان کی سوچ بھی کوئی بدنیتی پر مبنی نہ تھی' مگر اقبال کی سوچ نہایت اَرفع تھی کہ اسلام دین ہے اور یہ متحدہ قومیت کے اندر گم اور ضم ہو جائے تو اس کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اقبال کو شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا "بروز" کہتا

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

ہوں۔ "بَرَز" کسی چیز کے ظاہر ہونے کو کہتے ہیں۔ وہی فتنہ' جو سترھویں صدی میں اٹھا تھا' اب بیسویں صدی میں سر اٹھا چکا تھا۔ اب یہ بہت بڑے سیاسی مہاتما کے ذریعے سے اٹھا تھا جس کا نام مہاتما گاندھی ہے۔ اُس کا فلسفہ تھا کہ مذہب تو ہر کسی کا انفرادی معاملہ ہے' کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی مسجد میں چلا جائے یا کوئی مندر میں چلا جائے۔ کسی نے لٹیا لے لی جو ٹونٹی کے بغیر ہے اور کسی نے لوٹا پکڑ لیا جو ٹونٹی والا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی نے ٹخنوں سے اوپر پاجامہ پہن لیا اور کسی نے دھوتی لے لی' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب دین سچے ہیں' سب اچھے ہیں' سب کو جمع کرو' گھول کر ان کا ملغوبہ بناؤ اور ایک قوم بنا لو۔ ہندو' مسلمان' سکھ' پارسی اور عیسائی' کسے باشد' جو ہندوستان میں رہتا ہے وہ ایک متحدہ ہندی قومیت میں گم ہو جائے۔

یہ فلسفہ کیوں اٹھایا گیا؟ سمجھ لیجئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا' اکبر نے سمجھا تھا کہ ہندوستان کی عظمت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی اختلافات ہیں' یہ ختم ہو جائیں تو ہندوستان مضبوط و مستحکم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح گاندھی کا خیال تھا کہ یہاں ہندوستان میں انگریز سے نجات حاصل کرنے کے لئے مربوط اور متحدہ جدوجہد لازمی ہے۔ اگر ہندوستان کی اقوام' مسلمان اور ہندو علیحدہ علیحدہ رہیں تو انگریز کیسے جائے گا؟ انگریز تو شطرنج لے کر بیٹھے گا' اُس کے مہروں کو اِدھر اُدھر کر کے اپنی چال سیدھی کرے گا' مہروں کو استعمال کر کے کھیل کھیلتا رہے گا۔ گویا بالکل وہی صورتحال پیدا ہو چکی تھی جو دین اکبری کے وقت تھی۔ بدقسمتی سے اُس دور میں بہت بڑے علماء پٹی پڑھانے والے مل گئے تھے اور یہاں بھی ایک بہت بڑا عالم گاندھی جی کے فتراک کا نخچیر بن گیا۔ یعنی مولانا ابو الکلام آزاد متحدہ قومیت کا علمبردار بن کر اٹھا۔ وہ اتنی عظیم شخصیت کا مالک تھا کہ اس کے مقابلے کا کوئی شخص ہندوستان میں موجود نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے "الہلال" اور "البلاغ" والا ابو الکلام انتہائی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ پھر اُس کی خطابت' اس کی ادبیت' اُس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہندوستان میں اسلام کے لئے یہ انتہائی خطرناک صورتحال پیدا ہو رہی تھی۔ اس فتنے کے سامنے سینہ سپر ہوا ہے تو اقبال۔ علامہ اقبال نے اپنی نسبت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جوڑی ہے' مگر اشارتاً

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

یہ کہہ کر کہ ؎

لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

شیخ احمد سرہندیؒ کو تین سو سال ہو گئے تھے کہ انہوں نے اُس وقت ملت اسلامیہ کا تشخص محکم کیا تھا۔ اقبال کہتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں شیخِ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اِس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اِس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

ہند میں سرمایۂ ملت ختم ہو رہا تھا۔ ہمہ اُوستی تصوف چھا رہا تھا۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ لاہور میں مادھولال حسین کا میلہ لگتا ہے۔ یہ "مادھولال حسین" کس بلا کا نام ہے؟ یہ مذاہب کا ملغوبہ تھا۔ اس طرح کے ملغوبے بننے شروع ہو گئے تھے۔ بھگتی تحریک کے نام پر ہندوازم اور اسلام کا ملغوبہ بن رہا تھا۔ سکھ مذہب کو بھی اسی بھگتی تحریک نے جنم دیا تھا۔ توحید اسلام سے لی' باقی سب کچھ ہندوازم سے لیا۔ انہیں پتہ تھا کہ توحید کا راستہ اب یہاں کوئی نہیں روک سکتا اور اگر ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم رہتی ہے تو اسلام کا راستہ نہیں روکا جا سکتا۔ چنانچہ بھگتی تحریک میں سب اکٹھے ہو گئے' چاہے گرونانک ہو یا بھگت کبیر ہو۔ یہ درحقیقت دفاع تھا (Indian defence against Islam) کہ اسلام کی کچھ ایسی چیزیں جو اس کی اصل قوت تسخیر ہیں ہم لے لیں تاکہ اپنے دفاع کے

© rasailojaraid.

لئے ہم انہی کے ہتھیار انہی کے خلاف استعمال کر سکیں۔ یہ تو بعد میں باہم تصادم ہوا ہے تو یہاں سکھوں نے ایک militant unit کی صورت اختیار کر لی ورنہ یہ بھی بھگتی تحریک ہی تھی۔ گرو گرنتھ پڑھئے‘ اس میں قرآن کا ذکر ہے‘ حضور ﷺ کا ذکر ہے‘ بابا فرید کے اشعار ہیں‘ یہ سب کچھ ہے۔ امرتسر میں گولڈن ٹمپل کا سنگ بنیاد بھلا کس نے رکھا تھا؟ یہ حضرت میاں میر قادریؒ تھے جنہیں اس کے لئے خاص طور پر لاہور سے لے جایا گیا تھا۔ تو یہ وہ دور تھا کہ ملت کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اس صدی میں آکر پھر وہی خطرہ ظاہر ہوا کہ ملت اسلامیہ کا تشخص ناپید ہو رہا تھا۔ اس فتنہ کے آگے جو شخص چٹان کی طرح کھڑا ہوا وہ اقبال ہے۔ کسی اور کی حیثیت نہ تھی کہ ابوالکلام آزاد کے سامنے کھڑا ہوتا یا مولانا حسین احمد مدنیؒ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مدنیؒ کو بھی ایک مرتبہ دفاعی پوزیشن پر آجانا پڑا۔

شیخ الہندؒ کی سوچ مولانا مدنیؒ سے مختلف تھی۔ میری ایک کتاب ہے ”جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی“۔ میں اپنا رشتہ شیخ الہند سے جوڑتا ہوں‘ الحمدللہ ـــــ لیکن میرے نزدیک مولانا مدنیؒ کا موقف صحیح نہیں تھا اگرچہ وہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ وہ بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر ہم مل جل کر کوشش نہ کریں گے تو انگریز کو کیسے نکالیں گے۔ نتیجتاً وہ انگریز دشمنی میں ہندو کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ مگر ان کی نظر ہندو کے عزائم پر نہ تھی۔ ہندو کی امنگیں پروان چڑھ رہی تھیں اور وہ اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ یہ سب چیزیں مولانا مدنیؒ کی نظر سے اوجھل رہیں کیونکہ انگریز سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اس کے مقابلے میں دوسری چیزیں ذہن میں نہیں رہی تھیں۔ یہ بات پھر تازہ کر لیجئے کہ ان کی یہ سوچ ہرگز بدنیتی پر مبنی نہ تھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ جو انہیں بدنیت سمجھے خود اُس کے ایمان میں شک ہے۔ یہاں ایک عام اصول بھی مدنظر رہے کہ کسی کے ساتھ اختلاف کرتے وقت مخالف کے نقطۂ نظر کو پوری ہمدردی کے ساتھ سمجھنا چاہئے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں‘ ان حقائق پر مبنی میری ایک تالیف ”اسلام اور پاکستان“ کے پہلے باب میں میں نے ان سب چیزوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں جو کام شیخ احمد سرہندیؒ نے کیا‘ جو کہ گیارھویں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

صدی ہجری کے بہت بڑے مجدد تھے' وہ کام اس صدی میں اللہ تعالیٰ نے اُس مردِ قلندر سے لیا جس کا نام اقبال ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دہلی کی ایک مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج کل کے زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ مولانا مدنیؒ کی بات اس اعتبار سے درست تھی کہ اس بیسویں صدی کے زمانے میں دو اصول کار فرما ہیں' وطنیت اور لادینیت۔ دونوں مل کر ایک وحدت بنتے ہیں۔ لادینیت (Secularism) کیا ہے؟ یہ کہ ملک کا' ریاست کا' قانون کا' سیاست کا' نظام کا تعلق کسی مذہب سے نہیں۔ اور وطنیت (Nationalism) کیا ہے؟ یہ کہ ایک ملک میں رہنے والے تمام لوگ ایک قوم ہیں۔ اس قوم میں ہندو' مسلمان' سکھ' پارسی اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔ اگر حکومت کا تعلق مذہب سے ہو گا تو جھگڑا پیدا ہو گا۔ لہٰذا متحدہ وطنی قومیت کی صورت میں اس کا تعلق مذہب سے نہ ہو گا۔ یہ دونوں چیزیں آپس میں چارپائی کی چول کی طرح فٹ بیٹھتی ہیں۔ اقبال نے ان دونوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اس فتنے کی جتنی زبردست کیفیت تھی اتنی ہی بڑی چوٹ کی ضرورت تھی' جو اقبال نے بڑی جرأت اور بے باکی سے لگائی۔

مولانا مدنیؒ نے ٹھیک کہا تھا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں' آج کی دنیا میں ایسا ہوتا ہے ـــــ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام بھی اس کو قبول کرتا ہے؟ مثال کے طور پر آج کل سارا معاشی نظام سود پر چلتا ہے' یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے' مگر یہ دیکھیے کہ کیا اسلام بھی اسے قبول کرتا ہے؟ بالکل نہیں۔ تو مولانا مدنیؒ کے بیان پر علامہ اقبال نے کہا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ ؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باوُ نہ رسیدی تمام بولہبی است

یعنی ابھی تک عجم نے دین کے اسرار و رموز سمجھے ہی نہیں۔ ورنہ دیوبند جیسے بڑے

© rasailojaraid.

دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے یہ چیز' کہ انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ راگ الاپا ہے کہ ملت وطن سے بنتی ہے' محمد عربی ﷺ کے مقام سے کس قدر ناواقفی کی مظہر ہے۔ اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں میں ڈال دو' کیونکہ دین نام ہی مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ اگر وہاں تک نہ پہنچے تو یہ سراسر بولہبی یعنی ضلالت و گمراہی ہے۔ یعنی یہ پوری شریعت' پورے شعائر دینی' یہ سارے احکام اور اوامر و نواہی کا مجموعہ' یہ پورا تمدن' یہ پوری ثقافت تو قائم ہی محمد ﷺ کے بل پر ہے۔

اقبال کی اس گرفت پر پورے ہندوستان میں بڑا شور اٹھا۔ مولانا مدنیؒ کے بہت سے عقیدت مند تھے۔ جمعیت علمائے ہند کا بہت بڑا حلقہ تھا۔ پھر مولانا مدنیؒ نے بھی وضاحت میں ایسی بات کہی کہ اقبال نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ انہوں نے پہلی بات تو یہ کہی کہ میں نے "ملت" نہیں "قوم" کہا ہے' آپ نے اپنے شعر میں "ملت" کہہ دیا۔ دوسری بات [illegible] کہا تھا کہ ایسا ہوتا ہے' میں نے مشورہ تو نہیں دیا تھا' تلقین تو نہیں کی تھی۔ بہرحال یہ ایک ناپختہ بات تھی' اللہ ان کو معاف فرمائے۔ بعد ازاں آپس میں خط و کتابت ہوئی اور یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

پھر علامہ اقبال نے مولانا مدنیؒ کا نام لئے بغیر وطنیت کے اس تصور پر پہلے سے بھی بڑی چوٹ لگائی ـــــ ملاحظہ کیجئے ؂

اِس دَور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

جیسا کہ میں نے کہا علامہ اقبال حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کا ظل اور بروز ہے۔ چنانچہ ؎

"تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی"

کے مصداق تین سو سال بعد اب یہ فیض عام اقبال کے ہاتھوں جاری ہو رہا ہے۔

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اگلی صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'جیسا کہ پہلے بیان ہوا' رجوع الی القرآن ہے۔ انہوں نے قرآن کو جو بند تھا' کھول دیا' اور اس صدی کا سب سے بڑا داعیٔ قرآن جس پر قرآن کی عظمت کا سب سے زیادہ انکشاف ہوا وہ ہے اقبال۔ اس حیثیت میں وہ بروز ہے شاہ ولی اللہؒ کا۔ دیکھئے امت مسلمہ کے زوال کا سبب کس قدر سادہ انداز میں تشخیص کر رہا ہے ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اقبال کے اشعار کے اندر ایک تاثیر ہے۔ اس لئے کہ درا صل وہ قرآن و حدیث کی تعبیر کر رہے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) "اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کسی قوم کو بلندی عطا کرے گا اور اس کتاب کو ترک کرنے کے باعث کسی کو ذلیل و رسوا کرے گا۔" اقبال نے فارسی میں کہا ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی

یہاں بھی مہجوری کا لفظ قرآن ہی سے لیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہے: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝﴾۔ اقبال کے شعر کا مطلب ہے کہ تمہاری ذلت کا اصل سبب قرآن سے دوری اور روگردانی ہے اور تم خواہ مخواہ زمانے

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

کی گردش کا شکوہ کر رہے ہو کہ اس ذلت و رسوائی کا سبب یہ ہے۔ یہ خواہ مخواہ کے شکوے ہیں۔ اصل میں ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ یعنی یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔ پھر اقبال مسلمان قوم سے کہتا ہے ؎

اے چوں شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

اے وہ قوم کہ شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہے حالانکہ تیری بغل میں کتابِ زندہ (قرآن) موجود ہے۔ اس تمثیل پر غور کیجئے، شبنم انتہائی بے بسی کے عالم میں زمین کے گھاس پر قطروں کی صورت پڑی ہوتی ہے۔ لوگ، خاص طور پر جو صبح صبح سیر کو نکلتے ہیں، اسے اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مسلمان قوم کو دوسری اقوام پامال کر رہی ہیں۔ پھر یہاں بغل کا لفظ بھی ایک تلمیح ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا۔ جادوگروں نے رسیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو بربنائے طبع بشری خوف محسوس ہوا کہ میرا عصا بھی سانپ بن جاتا ہے اور ان کی رسیاں بھی سانپ بن گئیں، اب کیا ہو گا۔ ﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی﴾ اس جشن کے دن جب سب لوگ یہ مقابلہ دیکھنے آئے ہیں، کیا ہو گا؟ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ جو تمہارے ہاتھ میں ہے پھینکو۔ انہوں نے اپنا عصا پھینکا تو وہ بڑا سانپ بن گیا اور جادوگروں کے سانپوں کو ہڑپ کر گیا۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بھول گئے تھے کہ اُن کی بغل میں کتنی بڑی چیز ہے اسی طرح مسلمان بھی بھولے ہوئے ہیں کہ قرآن کی صورت میں اُن کے پاس کتنی بڑی قوت ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

گر تو میخواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمان بن کر زندہ رہو تو ایسا زندہ رہنا قرآن کے بغیر ناممکن ہے۔)

کون سا قرآن؟ اقبال خود ہی تعارف کراتا ہے :

حرفِ اُو را رَیب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

© rasailojaraid.

(اس کے حروف و الفاظ شک و شبہ سے بالا ہیں اور وہ بدل نہیں سکتے' اور اس کی آیتیں محتاج تاویل نہیں)۔

یہاں زورِ کلام ملاحظہ ہو۔ یہ زورِ بیان کرنے والے کی conviction کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جس شخص پر کسی شے کی جتنی عظمت منکشف ہو گی اتنا ہی اُس کے کلام میں زور ہو گا۔ مثال کے طور پر ایک اُجڈ اور گنوار کے سامنے کسی بلند پایہ مصور کا فن پارہ رکھئے' وہ سرسری نظر ڈال کر گزر جائے گا' مگر جو شخص فن کی باریکیوں سے واقف ہو گا وہ عش عش کر اٹھے گا۔ پس اقبال کا زورِ کلام بتاتا ہے کہ وہ فہم قرآن کے کس مقام پر کھڑا ہے۔ اقبال مزید کہتا ہے ؎

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

(یعنی قرآن زندہ جاوید کتاب ہے۔ اس کی حکمت ہمیشہ رہنے والی بھی ہے اور قدیم بھی ہے)

اقبال پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

(جو میرے دل میں ہے صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ یہ کتاب نہیں ہے کوئی اور ہی شے ہے۔)

یہ اور کیا ہے؟ یہ کلام الٰہی ہے! یوں سمجھئے کہ متکلم کی پوری شخصیت اُس کے کلام سے منعکس ہوتی ہے۔ کوئی بھٹیارا چند جملے بولے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ کوئی بھٹیارا بول رہا ہے۔ گنوار اور غیر مہذب شخص کی گفتگو اُس کے گنوار پن کا پتہ دے دے گی۔ مگر ایک عالم فاضل بولے گا تو اُس کے کلام سے فضیلت چھلکے گی۔ پس قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس میں متکلم یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جملہ صفات کا انعکاس موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

یہ رب کریم کی ذات کی طرح ہے اور اللہ تعالیٰ ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے۔ ہمیشہ زندہ اور کلام کرنے والا ہے۔ اس کے ظاہر پر غور کرنے والا بھی مراد پا جائے گا اور اس کے باطن میں جھانکنے والا بھی اس کی عظمت کو پا لے گا۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

جب یہ کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو انقلاب لے آتا ہے۔ اُس کی سوچ بدل جاتی ہے' نظریات بدل جاتے ہیں' امنگیں اور خیالات بدل جاتے ہیں' اقدار بدل جاتی ہیں غرضیکہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اُس کے اندر سے تبدیلی آتی ہے اور اب وہ بالکل بدلا ہوا (altogether changed) انسان ہو جاتا ہے۔ باہر کی تبدیلی تو ایک طرح کا بہروپ ہے جو (make up) ختم ہو جائے گا اصلی چہرہ نظر آ جائے گا۔ ضیاء الحق مرحوم نے ظہر کی نماز دفاتر میں پڑھنے کو کہا تو ملازمین مارے باندھے پڑھنے لگے' مگر عصر کے وقت تو صاحب جا کر سوئیں گے۔ یہ ہے بیرونی تبدیلی یا عارضی طور پر ڈالا ہوا نقاب۔ پس جب یہ قرآن کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو اُس کی کایا پلٹ دیتا ہے۔

محولہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے کے دو مطلب ہیں۔ پہلا یہ کہ جب انسان کا اندر بدل جاتا ہے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے' اس کا نقطۂ نظر ہی بدل جاتا ہے' وہ غلط ماحول کے اندر قطعی unfit ہو جاتا ہے۔ دوسرا معنی بھی ایک طرح سے پہلے معنی ہی کا نتیجہ ہے کہ اُس کی تبدیلی ماحول کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ انفرادی تبدیلی متعدی ہو کر پوری قوم کو اور پھر پوری دنیا کو بدل کر رکھ دے گی' کیونکہ قرآن کے مردِ مومن کا مشن ہی یہ ہے کہ اسلام کو پوری دنیا میں غالب کیا جائے۔ پس قرآن کی تعلیمات کے زیر اثر افراد بدلیں گے تو قوم بدلے گی۔ تو گویا اس میں انقلابِ نبویؐ کا پورا process آ گیا! جو قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے : ﴿ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ قرآن کی آیات اندر اترتی ہیں تو ذہن کھلتے ہیں۔ اندر کی گندگی' باطن کی نجاست دھل جاتی ہے اور انسان پاک صاف ہو کر پسندیدہ اخلاق کا حامل ہو جاتا ہے۔ کردار کی پستی ختم ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا اصلاح کا یہ عمل قرآن کے گرد ہی گھوم رہا

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہے۔ کونسا قرآن؟ جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ؂

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس قرآن کے بارے میں علامہ کہتے ہیں ؂

ہست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!

تم نے کبھی غور کیا قرآن کیا ہے؟ یہ سرمایہ دار اور سرمایہ پرست کے لئے موت کا پیغام ہے۔ قرآن دستگیری کرتا ہے غریبوں' محتاجوں' مسکینوں' بے کسوں کی اور بے سروسامان لوگوں کا سہارا بنتا ہے۔ دیکھئے' اسلام کے اولین قبول کرنے والے کون تھے؟ وہی غلام اور بے سہارا اپنے ہوئے لوگ اور اسلام کے شدید ترین دشمن کون بنے؟ مکہ کے چوہدری اور سرمایہ دار۔ اپنے اشعار میں اقبال خواجہ کا لفظ سرمایہ دار کے لئے لاتے ہیں ؂

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

گویا سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں کے خون سے سرخ شراب کشید کی ہے' جسے وہ شام کو بیٹھ کر پیتا ہے' کلب کے اندر یا اپنے گھر کے اندر۔ یہ لال پری مزدور کے خون سے ہی تو کشید کی ہوئی ہے۔ محنت غریب کی' خون پسینہ غریب کا' نتیجہ یہ کہ غریب محنتی کو پھر بھی دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہو اور اُس کے بچے بھوکے پیاسے بیماریوں کا شکار ہو جائیں اور جاگیردار اور سرمایہ دار عیش کریں۔ اقبال نے معاشرے سے اس طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے اور عدل اجتماعی کے نفاذ کے لئے انقلاب اور انقلاب ہی کا نعرہ لگایا ہے۔ اقبال کے یہ دو شعر تو عجیب کیفیت کے مظہر ہیں ؂

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد' گفتند کہ بر ہم زن!

© rasailojaraid.com

(اللہ نے مجھ سے پوچھا کہ اے اقبال میں نے تمہیں اس دنیا میں بھیجا ہے' میری یہ دنیا تمہیں اچھی بھی لگی؟ میں نے جواب میں کہا کہ نہیں لگی! اس پر اُس نے مجھے حکم دیا کہ اسے درہم برہم کر کے رکھ دو)

یہ ہے انقلاب کی حقیقت۔ کوئی حساس اور ذہین آدمی اس معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے۔ ناانصافی' وسائل پیداوار کی غلط تقسیم' اونچ نیچ' ظلم و زیادتی' استحصال' انسان انسان کا خون پی رہا ہے' انسان نے انسان کو غلام بنایا ہوا ہے' قوموں نے قوموں کو غلام بنا رکھا ہے' یہودی پوری دنیا کا خون کشید کر کے اپنے بینکوں میں اکٹھا کر رہے ہیں' یوں پوری دنیا ان کی مقروض ہے۔ حساس انسان اس صورتحال کو کیسے برداشت کرے گا؟ وہ تو نظام کی تبدیلی چاہے گا۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔ اور انقلاب کا عمل اقبال کے نزدیک اس طرح ہے

با نشہ درویشی در ساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلے تو درویشی اختیار کرو' دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہو' ہر طرح کی باتیں سنو' مگر ادھر کان نہ دھرو' اپنی دُھن میں لگے رہو۔ دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں جو لوگ اکٹھے ہوں اُن کی تربیت و تزکیہ کیا جائے۔ وہ لوگ حرام کو چھوڑ دیں' گندگیوں سے منہ موڑ لیں۔ بدعات و اوہام اور شرکیہ عقائد سے تائب ہوں۔ مختصراً ان سب کی اپنی زندگی کے اندر اور گھر کے اندر اسلام نافذ ہو جائے۔ اس process میں لوگ پاگل کہیں گے' دقیانوسی اور پرانے خیالات والا ہونے کا طعنہ دیں گے۔ مگر یہ سب کچھ برداشت کرنا اور جھیلنا ہے۔ یہاں تک کہ ایذا رسانی کا مرحلہ بھی آئے گا مگر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ مکے میں حضور ﷺ کی سیرت کے بارہ سال اسی نہج پر گزرے ہیں۔ یہ پوری کیفیت اقبال نے ایک مصرعے میں بیان کر دی ہے

با نشہ درویشی در ساز و دمادم زن

اب اگلا مرحلہ ہے کہ جب تیار ہو جاؤ' مضبوط طاقت بن جاؤ' معتد بہ تعداد میں ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو اپنی ذات اور اپنے گھر میں اسلام نافذ کر چکے ہوں اور وہ جانیں دینے کو

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تیار رہوں' ایک امیر کا حکم ماننے کو تیار رہوں' تو اب بیٹھے نہیں رہنا بلکہ پوری طاقت کے ساتھ باطل سے ٹکرا جاؤ۔ یہ سارا process اقبال نے دوسرے مصرعے میں بند کر دیا ہے ؂

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

میری کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" علامہ کے اسی ایک شعر کی شرح ہے۔ حقیقت میں میں نے یہ چاروں مراحل دعوت' تربیت' تنظیم اور صبر محض سیرت النبی ﷺ کے مکی دور سے لئے ہیں۔ پھر ہجرت کا مرحلہ آیا۔ حضورؐ اور آپ کے جان نثار ساتھی مدینہ پہنچ گئے۔ اب باطل سے ٹکراؤ کا مرحلہ آگیا اور اس کا آغاز محمد ﷺ نے کیا۔ کفر کے ساتھ خوب پنجہ آزمائی کی اور بالآخر آپؐ کی حیات مبارکہ میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلام غالب آگیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں غلبۂ اسلام عرب سے باہر دور دور تک ہو گیا۔ پھر اس کے بعد زوال شروع ہوا۔ ہندوستان میں یہ زوال اکبر اعظم کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ وہیں سے اس کی ایک upward movement شروع ہوئی جس کے گل سر سبد شیخ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ دہلوی' سید احمد بریلوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہم تھے۔ اس کے بعد اسی تحریک کا نیا سلسلہ چلا' جس کی اہم شخصیت اقبال ہیں۔ یہ شخص مدرسوں' دار العلوموں کا پڑھا ہوا نہیں۔ خانقاہوں کا تربیت یافتہ نہیں۔ یہ تو مشن سکول اور مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا ہوا تھا۔ پھر جرمنی اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا۔ مگر فکر اسلامی کی تجدید اس کے ہاتھوں ہوئی۔ سیکولرزم پر کاری ضرب اس نے لگائی۔ نیشنلزم کا سر اس نے کچلا۔ دین کو مسخ کرنے کا جو فتنہ دوبارہ اٹھا تو شیخ احمد سرہندیؒ کے بروز کی حیثیت سے اس کا خاتمہ اقبال ہی نے کیا۔ پھر دعوت رجوع اِلی القرآن کو امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے ایک مقام تک پہنچایا تھا۔ علامہ اقبال نے اس کو آگے بڑھایا اور پورے زور سے اس کا پرچار کیا کہ ؂

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اب آیئے ہندوستان کی تحریک آزادی کی طرف۔ ہندوستان پہلے دار الاسلام تھا' یہاں

© rasailojaraid

مسلمانوں کی حکومت تھی، جو کمزور ہوئی تو طوائف الملوکی کی صورت بن گئی۔ اسی دوران باہر سے انگریز آ گئے اور رہوتے ہوتے انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ انگریزی تسلط سے نجات کے لئے جو تحریکیں اٹھیں وہ ناکام ہو گئیں، سید احمد بریلویؒ کی انقلابی جدوجہد ناکام ہوئی اور حضرت شیخ الہندؒ کی ریشمی رومال کی تحریک بھی ناکام ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ ایک حقیقت پسندانہ بیان تو وہ تھا جو ابوالکلام آزاد نے دیا کہ آزادی کی جدوجہد میں کوئی مدد نہ افغانستان سے ملے گی اور نہ ہی ترکوں سے۔ یہ بات ابوالکلام نے ۱۹۱۵ء میں کہی اور صحیح کہی۔ دوسرا حقیقت پسندانہ تصور علامہ اقبال کی سمجھ میں آیا۔ وہ یہ کہ پورے ہندوستان کا اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کا معاملہ tackle کرنا تو ہمارے لئے آسان نہیں، البتہ ہندوستان کی تقسیم کر کے اس کے شمال مغربی حصہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہو جائے جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں تو وہاں اس بات کا امکان ہے کہ اسلام کو اس کی اصل حالت میں قائم کرنے کی دوبارہ کوشش کی جائے جس شکل میں محمد عربی ﷺ نے اس کو جزیرہ نمائے عرب میں قائم کیا تھا۔ یہ ہے فکر اقبال اور یہ ہے نظریۂ پاکستان۔

اس پس منظر سے یہ معلوم ہوا کہ ایک سوچ یہ بھی تھی کہ مسلمان ہندو سے مل کر انگریز کو نکالیں، بعد میں ہندو سے نمٹ لیں گے۔ مگر بعد میں کیا نمٹیں گے؟ ہندو تین چار گنا زیادہ، منظم، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھا، مسلمان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، حقیقت کے اعتبار سے یہی نظر آ رہا تھا۔ اس لئے اقبال کو جو بات سمجھ میں آئی وہ یہ کہ ہندوستان کی تقسیم ہو۔ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں انہوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقدیرِ مبرم ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گی (اُس وقت مشرقی حصہ علامہ کے ذہن میں نہ تھا) اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کی تعلیمات پر عرب ملوکیت کے دور میں جاگیرداری، سرمایہ داری اور قبائلی عصبیت کے جو پردے پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر صحیح اسلام کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ جہاں تک اسلامی عباداتِ کا تعلق ہے ان سے مسلمانوں کو ہندوستان میں کوئی نہیں روکتا تھا، انگریزی چھاؤنیوں کے اندر نمازیں پڑھی جاتی تھیں، اذانیں دی جاتی

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

تھیں۔ اصل مسئلہ تو اسلامی ریاست کے قیام کا تھا۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔

تحریک پاکستان کے حوالہ سے یہ سارا عمل دو عظیم شخصیتوں کا مرہون منت ہے۔ ایک علامہ اقبال' دوسرے قائداعظم محمد علی جناح۔ لیکن ان کے مابین ایک امتیاز ہے جو عام طور پر لوگ پیش نظر نہیں رکھتے۔ وہ یہ کہ اقبال مفکرِ پاکستان' مصورِ پاکستان اور مبشر پاکستان ہیں جبکہ قائداعظم معمارِ پاکستان' مؤسس پاکستان اور بانی پاکستان ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھئے' ورنہ ظلم ہو گا۔ عربی میں ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اُس کے صحیح مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔ اس طرح اگر قائداعظم کو مفکر کہیں گے تو ظلم ہو گا۔ وہ نہ مفکر تھے نہ فلسفی' وہ سیاست دان تھے' بات کے پکے تھے' ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا اور ان کی گفتگو میں اور عمل میں کوئی پیچ نہ ہوتا تھا۔ ایک طویل عرصے تک تو وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں رہے مگر انہوں نے ہندوؤں کے قریب ہو کر دیکھ لیا کہ ان سے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی چنانچہ وہ مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ اب اُن کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا یعنی مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے غلبے سے بچانا۔ قیام پاکستان کے وقت ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان تھے' ساڑھے چھ کروڑ پاکستان آ گئے' باقی ساڑھے تین کروڑ ہندوستان میں رہ گئے۔ اس طرح قیام پاکستان کے نتیجہ میں دو تہائی مسلمان ہندو اکثریت کے غلبے سے نجات پا رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کا دفاع تھا' تاکہ مسلمانوں کا تمدن' تہذیب اور ثقافت مٹ نہ جائیں اور ہندو انہیں اپنے اندر جذب نہ کر لے۔ کیونکہ تاریخ میں ہندو تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت یہ سمجھی گئی ہے کہ یہ دوسری تہذیبوں کو اپنے اندر ضم کر لیتی ہے اور اگر کوئی ضم نہ ہو تو اسے نکال باہر کرتی ہے۔ دیکھئے بدھ مت ہندوستان میں پیدا ہوا مگر یہاں سے اس طرح نکالا گیا کہ اس کا یہاں نام و نشان تک نہیں ہے۔ بدھ مت والے چین میں ہوں' کمبوڈیا میں ہوں' کہیں بھی ہوں مگر ہندوستان میں نہیں ہیں۔ یہ تو صرف اسلام ہے جسے ہندو ازم اپنے اندر assimilate نہیں کر سکا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے بھی کوتاہی کی۔ یہاں اگر انہوں نے دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا ہوتا تو یہاں ہندو نام کی کوئی شے باقی نہ رہتی۔ مگر مسلمانوں نے عیاشیاں کیں' بدمعاشیاں کیں' محل بنائے بلکہ

© rasailojaraid.com

تاج محل بنائے۔ پس جو ہم نے بنایا وہ بن گیا' جو نہیں بنایا نہیں بنا۔ الغرض اب اگر یہ ملک ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوتا تو عددی اکثریت کے فیصلہ کن ہونے کی وجہ سے ہندو غالب رہتے اور مسلمانوں کا تشخص ہی ختم ہو جاتا۔

اقبال نے احیائے اسلام کی آواز بلند کی[1]۔ قائد اعظم نے مسلمانوں کے دفاع کی کوشش کی۔ اس پورے عمل کا نام تحریک پاکستان ہے۔ قائد اعظم کے سامنے دفاعی پہلو زیادہ تھا' احیائی کم۔ مگر جب تحریک شروع ہوئی تو اسلام کا نام لینا ناگزیر تھا کیونکہ اسلام کا نام لئے بغیر مسلمان اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!" کا نعرہ نہ لگتا تو مسلم لیگ کو اسمبلی کے اندر مینڈیٹ کیسے مل جاتا؟ لہٰذا قائد اعظم کے ایسے بیانات آپ کو مل جائیں گے کہ اسلام ہمارا constitution ہے جو چودہ سو سال پہلے طے ہو چکا ہے۔ مگر قائد اعظم کا اپنا ایک مزاج تھا' اپنی ایک ذہنیت تھی' اور وہ پاکستان بنتے ہی ظاہر ہو گئی جب انہوں نے کہا :

> *..... you will find that in the course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is personal faith of each individual, but in the political sence as citizens of the State.*

یہ سیکولرزم نہیں تو اور کیا ہے؟ قائد اعظم کی منزل تو حاصل ہو گئی کہ مسلمان ہندو کے تسلط سے نکل آیا۔ لیکن اگر اس ذہنیت کو پاکستان کی تعمیر کے لئے بنیاد بنائیں گے تو یہ درحقیقت تصور پاکستان کی نفی ہے۔ نقشہ آرکیٹیکٹ بناتا ہے' تعمیر معمار کرتا ہے۔ معمار قائد اعظم ہیں' اقبال نہیں۔ وہ سیاست کے اندر کوئی مقام ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو مسلم لیگ کے ادنیٰ کارکن رہے' انہوں نے صوبائی شاخ کا صدر رہنا گوارا کیا۔ البتہ فکر اور احیائی جذبہ تو اقبال ہی کا ہے۔ پس نظریہ پاکستان کے حوالے سے ہمیشہ توجہ اقبال کی

---

(۱) ایران کے مشہور شاعر ملک الشعراء بہار علامہ اقبال کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت' واحدے برصد ہزاراں برگزشت

(ترجمہ) "موجودہ دور اقبال کا دور ہے' وہ ایک انسان تھا مگر لاکھوں پر بھاری تھا"۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

طرف رہنی چاہیے۔ ہاں قائداعظم کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُن کی ولولہ انگیز قیادت اور کردار کی پختگی نے پاکستان بنوا دیا۔ ان دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ“ کا نعرہ ہی تھا کہ راس کماری سے درۂ خیبر تک اور چٹا گانگ سے لے کر مکران تک کے مسلمان قیام پاکستان کے مطالبہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے‘ اور ساتھ ہی ”مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ“ کا نعرہ تھا جس سے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا وزن اس پلڑے میں پڑ گیا اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

اب ذرا تھوڑا پیچھے چلئے۔ علامہ اقبال شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بروز تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کے وقت ہندوستان کا حال یہ تھا کہ ایک طرف سکھوں نے اودھم مچایا ہوا تھا‘ دوسری طرف مرہٹہ قوت زور و شور سے اُٹھی ہوئی تھی‘ پورا ہندوستان اس فتنہ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس وقت دہلی کی ایک چھوٹی سی مسجد ’مسجد شاہجہانی میں شاہ ولی اللہؒ کی صورت میں ایک مردِ درویش بیٹھا پورے ہندوستان کو دیکھ رہا تھا کہ یہاں کوئی مسلمان عسکری یا سیاسی راہنما کے طور پر ایسا نظر نہیں آتا جو اس خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ افغانستان سے ایک صاحب عزیمت شخص احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر ہندوستان کی ابتر حالت اور صنم خانۂ ہند میں ملت اسلامیہ کو درپیش شدید خطرات سے آگاہ کرتے ہیں اور اُسے ہندوستان پر حملہ کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی کے نتیجہ میں احمد شاہ ابدالی آتے ہیں‘ پانی پت کی تیسری جنگ ہوتی ہے جس کے نتیجے میں مرہٹوں کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے اگلے ہی سال شاہ ولی اللہؒ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت اقبال دیکھ رہے تھے۔ ہندوستان کا مسلمان اس وقت leaderless تھا۔ قائداعظم ہندوستان کے مسلمانوں سے اتنے مایوس اور بددل ہوئے کہ انگلستان جا کر پریکٹس شروع کر دی۔ ان کے الفاظ ہیں ”میں ایسی قوم کی قیادت کیسے کروں جس کے بڑے بڑے لیڈروں کا حال یہ ہے کہ دن میں جو بات مجھ سے کرتے ہیں شام کو جا کر وہ گورنر کو بتا دیتے ہیں“۔ ایسے میں اقبال جناح کو persuade کرتے ہیں کہ واپس آ جائیں‘ آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں جو اس وقت قیادت سنبھال سکے۔ اقبال کا یہ بلاوا اس قدر خلوص و اخلاص پر مبنی اور اتنا زوردار تھا کہ جناح [illegible] واپس آ گئے۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

علامہ اقبال کی فکری وراثت

میں نے ۱۹۹۴ء میں ایک سلسلہ مضامین تحریر کیا تھا' جس میں ان مراحل کا ذکر کیا تھا جن سے گزر کر ہندوستان میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل ہوئی۔ یہ کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ مگر بعد ازاں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم نے اپنے انتقال سے چند ماہ قبل اقبال کی زندگی کا اہم راز صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ علامہ اقبال یہ سمجھ چکے تھے کہ خالص قومی تحریک کے نتیجے میں اسلام کا احیاء نہیں ہو سکتا' اس کے لئے کسی اور قسم کی تحریک درکار ہے' مگر اس کے لئے جس قسم کی ہمت درکار تھی وہ اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کا غیبی اشارہ پچیس برس پہلے مجھے ہوا تھا' جب میں انگلستان میں تھا۔ اب پھر چند سال پہلے اسی طرح کے غیبی اشارات مجھے ہوئے۔ میں نے اس ضمن میں تھوڑی سی کوشش بھی کی مگر قابل اعتماد لوگ مفقود تھے' لہٰذا بات جلد ہی ختم ہو گئی۔ وہ بات یہ تھی کہ "اسلام کے نام پر ایک ملک حاصل کر لینا بالکل اور شے ہے اور اسے واقعتاً اسلامی ریاست بنا دینا' اس میں نظام خلافت قائم کر دینا' اس کے لئے کسی اور قسم کی جدوجہد درکار ہے۔ اس کے لئے تو ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ایک امیر کی امارت پر قائم ہو جس سے بیعت کا تعلق ہو' جس میں شامل ہونے والے دین پر عمل کرنے کا اقرار صالح کریں۔ حتیٰ کہ امیر کو شوریٰ نامزد کرنے کا حق ہو مگر امیر شوریٰ کی رائے کا پابند نہ ہو"۔ یہ خط و کتابت ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کے چار سالوں میں ملتی ہے[۲]۔

چنانچہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو کر مسلمانوں نے ایک آزاد مسلمان ریاست تو قائم کر لی مگر واقعتاً اس میں خلافت راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام رائج نہیں ہو سکا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ نعرہ تو یہ تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" یعنی مسلم خواہ شراب پیتا ہو یا شراب کا ٹھیکہ چلاتا ہو اس سے کوئی غرض نہیں' نام مسلمانوں والا ہونا چاہئے۔ ایسی جماعت سے اسلام تو نہیں آ سکتا۔

---

(۲) اس کی تفصیل "علامہ اقبال کی آخری خواہش" نامی کتابچے میں ملے گی جو عزیزم حافظ عاکف [illegible]

© rasailojaraid

علامہ اقبال کی آخری خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جمعیت شبان الہند کے نام سے ایک جماعت بنی' اس کا دستور تیار ہوا' بیعت کا فارم بنا' اس کی امارت کے لئے علامہ اقبال کا نام تجویز ہوا' انہوں نے اسے قبول بھی کر لیا۔ بعد ازاں یہ تجویز ناکام ہو گئی اور بات آگے نہ چل سکی۔

اقبال نے خود کو دو پیروں کا مرید مانا ہے' ایک پیر مولانا روم' دوسرے اکبر الٰہ آبادی۔ میں علامہ اقبال کو اپنا مرشد فکری مانتا ہوں اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا آخری سورج غروب ہو رہا تھا یعنی جب اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا' اس وقت شاہ ولی اللہؒ کی عمر پانچ' چھ برس تھی۔ بیسویں صدی میں فکری سورج علامہ اقبال کی صورت میں طلوع ہوا۔ جب یہ غروب ہو رہا تھا اس وقت میری عمر چھ برس تھی۔ میری سوچ اور فکر پر سب سے گہری چھاپ علامہ اقبال کے افکار ہی کی چھاپ ہے۔ میں نے پانچویں جماعت میں یہ شعر پڑھا تھا ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور میری پوری زندگی کا رخ معین کرنے میں اس شعر نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس صدی میں مسلمانان ہند کو صحیح فکری راہنمائی دینے کی ابتدا اقبال نے کی۔ اس کی تعمیل کی پہلی جدوجہد ابو الکلام آزاد نے ١٣۔١٩١٢ء میں حزب اللہ بنا کر کی۔ اس سلسلہ کی دوسری کوشش مولانا مودودی نے کی۔ یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اس جوہر قابل کی شناخت بھی اقبال ہی نے کی۔ ان کی عقابی نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ ایک باصلاحیت شخص ابوالاعلیٰ مودودی نامی حیدر آباد دکن کی سنگلاخ زمین میں بیٹھا ہوا ہے' چنانچہ اس کو وہاں سے بلا کر پنجاب کے زرخیز ترین علاقے ضلع گورداس پور میں لا کر بٹھایا۔ علامہ کی مہلت عمر ١٩٣٨ء میں ختم ہو گئی اور ١٩٤١ء میں مولانا مودودی نے جماعت اسلامی بنائی' کیونکہ جمعیت شبان الہند کی تجویز تو کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اقبال نے جناح کو انگلستان سے وطن واپس بلایا اور اقبال ہی نے مولانا مودودی کو دکن سے بلایا۔ میرے بڑے بھائی بیان کرتے ہیں کہ خود انہوں نے مولانا مودودی کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "جب تک

© rasailojaraid

میں حیدر آباد میں تھا کوئی مجھ سے آکر یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں"۔ مولانا پنجاب آئے تو یہاں علامہ اقبال کی شاعری کا ہل چل چکا تھا' زمین زرخیز ہو چکی تھی۔ یہاں آکر مولانا نے اقامت دین کا بیج ڈالا۔ اس کام کے لئے ایسے لوگوں پر مشتمل جماعت بنائی جو خود دین پر عامل ہوں۔ نام جمعیت شبان الہند نہ تھا مگر سارا نقشہ وہی تھا کہ یہ جماعت الیکشن میں حصہ نہیں لے گی' سیاست نہیں کرے گی' البتہ سیاسی معاملات میں راہنمائی کرے گی۔ مگر مولانا مودودی کی تشکیل کردہ جماعت میں بھی ایک کمی رہ گئی کہ یہاں بیعت کی بنیاد نہ تھی۔ حالانکہ ابوالکلام آزاد نے حزب اللہ بیعت ہی کی بنیاد پر بنائی تھی۔ اقبال کا جمعیت شبان الہند کا نقشہ بھی بیعت ہی کی بنیاد پر تھا۔

"علامہ اقبال کی آخری خواہش" کا آپ ضرور مطالعہ کریں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اُن کے خواب کیا تھے۔ آج یہ خواب الحمدللہ تنظیم اسلامی کے نام سے پورے ہو رہے ہیں۔ اصل میں تو اللہ کی مشیت سے سب کچھ ہوتا ہے' انسان تو اس میں ذریعہ بنتا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے علی تمہارے ذریعے سے اللہ اگر کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑی دولت ہے"۔ بہرحال اقبال کا ایک خواب' قیام پاکستان کا خواب تو قائداعظم کے ہاتھوں پورا ہوا۔ الحمدللہ کہ اُن کے دو خواب راقم الحروف کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے پورے کرائے۔

جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو گورداس پور میں لا بٹھایا' جہاں چوہدری نیاز علی خان علامہ کے عقیدت مند تھے۔ وہ ضلع گورداس پور کے زمیندار تھے' انگریز کے دور میں محکمہ نہر میں ایس ڈی او تھے۔ وہ ریٹائرڈ ہو کر آئے تو علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی مفید کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میرے پاس زمین ہے' میں وقف کرنے کو تیار ہوں' بتایئے کیا کروں؟ علامہ نے کہا ٹھیک ہے تم ٹرسٹ بناؤ' ایک ایسا ادارہ بناؤ جہاں گریجویٹ مسلمانوں کو رکھا جائے اور انہیں قرآن کریم کی تعلیم دی جائے' مگر وہاں ایسا عالم دین ہونا چاہئے جسے انگریزی زبان پر عبور حاصل ہو' وہ جدید افکار سے واقف ہو اور ذہنی اشکالات کو بھی حل

© rasailojaraid.com

کر سکے۔ انہوں نے علامہ کے خیالات سے اتفاق کیا۔ چنانچہ دار الاسلام ٹرسٹ قائم ہو گیا، عمارتیں بن گئیں۔ اب عالم دین کی تلاش ہوئی۔ ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا تو مصر کے قدیم اور مشہور دار العلوم جامعۃ الازہر کے ریکٹر کو لکھا کہ ہمیں ایک ایسا عالم دین فراہم کیجئے جو انگریزی پر دسترس رکھتا ہو اور قرآن پاک پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ وہاں سے جواب آیا کہ ہمارے پاس ایسا کوئی عالم موجود نہیں۔ پس سکیم یہیں ختم ہو گئی۔ اب اس عمارت میں مولانا مودودی کو بٹھایا گیا۔ پھر وہاں جماعت اسلامی کا مرکز بن گیا۔ بعد ازاں مولانا مودودی نے اسی طرح کی سکیم بنا کر راولپنڈی میں ادارہ قائم کیا جہاں گریجویٹس کو قرآن پڑھایا جائے اور عربی کی تعلیم دی جائے۔ اس کے لئے مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الجبار غازی صاحب راولپنڈی منتقل بھی ہو گئے تھے، لیکن اس کے بعد مولانا نے اپنی سیاسی مصروفیات اس قدر بڑھا لیں کہ وہ ادارہ بھی ختم ہو گیا۔ مولانا کے سیاسی میدان میں کود پڑنے سے سارے افرادی اور مادی وسائل سیاست میں استعمال ہو گئے اور تعلیمی منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بہرحال اللہ کے فضل و کرم سے ۱۹۶۷ء میں اللہ نے وہ خواب مجھے دکھایا۔ چنانچہ میں نے قرآن اکیڈمی کا نقشہ پیش کیا۔ ۱۹۷۲ء میں انجمن خدام القرآن وجود میں آئی اور ۱۹۷۶ء میں لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی جس کے بطن سے دس سال بعد ۱۹۸۷ء میں قرآن کالج بر آمد ہوا۔ الحمد للہ اب ہم گریجویٹس، پوسٹ گریجویٹس، پی ایچ ڈی، ڈاکٹرز اور انجینئرز کو قرآن کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمارے پاس امریکہ سے بھی کچھ حضرات بیوی بچوں سمیت اور کچھ نوجوان انفرادی طور پر آئے ہیں۔ یہ لوگ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ڈاکٹر اور انجینئر ہیں، جو قرآن سیکھ رہے ہیں اور عربی پڑھ رہے ہیں۔

دعوت رجوع الی القرآن کا یہ کام برعظیم پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شروع کیا، پھر ان کے بیٹوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ پھر اللہ نے ہمیں توفیق دی کہ اس کام کو جاری رکھیں (۳)۔ ہمارا ہدف یہی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جو اعلیٰ صلاحیتوں کے

---

(۳) اس کی تفصیل راقم کی کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں ملاحظہ ہو۔

© rasailojaraid.c

حامل ہوں، فکر جدید کے ساتھ فکر قدیم سے بھی وابستہ ہوں، اسلاف سے ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہو، جدید سائنس اور جدید فکر کے حوالے سے وہ آن کی تمام بلندیاں سر کریں۔ ایسے نوجوانوں کا پیدا کرنا ہماری اکیڈمیز کا مقصد ہے اور اسی لئے انجمن ہائے خدام القرآن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی جس کی بنیاد بیعت پر ہے۔ مجھے ۱۹۹۵ء تک معلوم نہ تھا کہ اقبال شخصی بیعت اور امیر کی امارت کے قائل تھے۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ انہوں نے بہت بڑا ایثار کیا کہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور قائداعظم کے ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے محنت سے کام کیا{۴}۔ بہرکیف بیعت کی بنیاد پر ایک تنظیم کا قیام بھی علامہ اقبال کی خواہش تھی جو راقم الحروف کے ہاتھوں بفضلِ ایزدی پوری ہو رہی ہے۔ تنظیم اسلامی کے نام سے ہم نے جو قافلہ بنایا ہے وہ امارت اور بیعت کی بنیاد پر ہے۔ اس میں وہ لوگ جمع ہو رہے ہیں جو اپنا تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہیں تاکہ غلبۂ اسلام کا دور آ جائے اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو جائے۔ اسی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ہم اس مضمون کی احادیث بھی عام کر چکے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا اللہ تعالیٰ نے الف ثانی یعنی دوسرے ہزار سال کے مجددین کے لئے یہی علاقہ منتخب فرمایا۔ پہلے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، پھر شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، شیخ الہند، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور پھر تنظیم اسلامی و انجمن خدام القرآن۔ یہ سلسلہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کے مصداق یہاں تک پہنچا ہے۔ اب رفتہ رفتہ مزید آگے بڑھنے اور اوپر چڑھنے کے لئے مردان کار اور باہمت نوجوانوں کی ضرورت ہے جو غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں لگ جانے کو اپنی سعادت سمجھیں اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیں۔ بقول اقبال ؎

{۴} اس کی تفصیل راقم کی کتاب "علامہ اقبال اور ہم" میں موجود ہے۔

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid